حجاباتِ علم

(جناب مولانا امین احسن صاحب اصلاحی)

[یہ مضمون تزکیۂ نفس کے مباحث کے سلسلہ کی ایک کڑی ہے اس وجہ سے اس کو اس کے سیاق کے ساتھ ملا کر پڑھیے۔]

پچھلے مباحث سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو چکی ہے کہ علم حقیقی دراصل کیا ہے اور اس کے حاصل کرنے کے وسائل و ذرائع کیا ہیں؟ اب ہم یہ بتائیں گے کہ اس علم کے حصول کی راہ میں کیا کیا رکاوٹیں پیدا ہوتی ہیں، وہ روکاوٹیں کہاں سے ابھرتی ہیں اور ان کے دُور کرنے یا ان پر قابو پانے کی تدابیر کیا ہیں۔

ہمارے نزدیک یہ روکاوٹیں یا یہ حجابات دو قسم کے ہیں۔ ایک تو وہ رکاوٹیں ہیں جن کے پیدا ہو جانے کے بعد علم حقیقی کے حصول کا راستہ ہی سرے سے بند ہو جاتا ہے۔ انسان کے لیے یہ ممکن ہی نہیں رہ جاتا کہ ان کے ہوتے ہوئے اس کے اندر علم حقیقی کے لیے کوئی رغبت پیدا ہو سکے، یا اس کے حاصل کرنے کے لیے وہ کوئی جدوجہد کر سکے یا اس کی خواہش اور طلب کے بغیر اگر وہ اس پر کہیں سے برس پڑے تو وہ اس کی قدر کر سکے۔

دوسری وہ روکاوٹیں ہیں جن کی نوعیت آفتوں اور بیماریوں کی سی ہے یعنی یہ ایک مصیبت کی طرح انسان کے حاصل کردہ علم پر نازل ہوتی ہیں اور پھر پالا تو دیمک کی طرح آہستہ آہستہ اس پورے ذخیرہ کو چاٹ جاتی ہیں یا ایک برقی خاطف کی طرح چشم زدن میں اس کو سوخت کر کے رکھ دیتی ہیں۔ ہم نے پہلی قسم کی رکاوٹوں کے لیے حجابات کی اصطلاح اختیار کی ہے، اور اس دوسری قسم کی مصیبتوں کے لیے آفات کی۔ ہم اس فصل میں حجابات کی وضاحت کریں گے۔ اس کے بعد ایک علیحدہ فصل میں آفات پر بحث کریں گے۔ پھر ایک مستقل فصل میں ان کے دُور کرنے یا ان پر قابو پانے کی تدابیر بیان کریں گے۔

ہمارے نزدیک بڑے بڑے حجابات چار ہیں جن کو مختصر تشریح کے ساتھ ہم یہاں بیان کرتے ہیں۔

۱۔ حبِ عاجلہ: علم حقیقی سے محروم رکھنے والے حجابات میں سے سب سے بڑا حجاب حبِ عاجلہ

کا حجاب ہے۔ حبِ عاجلہ کا مطلب ہے آخرت کی زندگی اور اس کی نعمتوں کے مقابل میں دنیا کی زندگی اور اس کی لذتوں اور راحتوں کو ترجیح دینا۔

آدمی کے سامنے سب سے پہلے اس کی جسمانی ضرورتیں اور خواہشیں ہی آتی ہیں اور انہی کے پورا کرنے پر اس کے مادی اور جسمانی وجود و بقا کا انحصار ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے وہ مجبور ہوتا ہے کہ ان خواہشوں اور ضرورتوں کی تکمیل کے لیے کوشش کرے۔ اس خاص حد تک ان خواہشات اور ضروریات کی تحصیل میں انسان کا مصروف ہونا خود قدرت کا منشا ہے۔ چنانچہ اسی مصلحت سے قدرت نے ان کے ساتھ لذت کی چاٹ بھی لگا رکھی ہے تاکہ انسان ان کو ایک بالکل بے مزہ اور محض مشقت کا دھندا سمجھ کر چھوڑ نہ بیٹھے بلکہ ان کے مطلوبات کو حاصل کرنے میں جوش اور سرگرمی کے ساتھ کوشش کرے تاکہ ان کے واسطہ سے انسان کے جو شخصی اور نوعی مصالح پورے ہونے ہیں وہ پورے ہوں۔

لیکن ان چیزوں کے اندر انسان کا انہماک بس ایک خاص حد تک ہی مطلوب ہے۔ اگر یہ انہماک اس خاص حد سے آگے بڑھ جائے تو اس سے انسان کے روحانی اور اخلاقی اقدار کو سخت نقصان پہنچتا ہے پھر یہ خواہشیں اور لذتیں انسان پر اس طرح سوار ہو جاتی ہیں کہ بس وہ بطن و فرج کا غلام بن کے رہ جاتا ہے اور اس کو یہ سوچنے کی کبھی فرصت ہی نہیں ملتی کہ ان خواہشوں کی غلامی کے سوا اس کی زندگی کا کوئی اور مقصد بھی ہے اور اس زندگی کے بعد کوئی اور زندگی بھی ہے جس کے تقاضے اور مطالبات اس زندگی کے تقاضوں اور مطالبات سے کچھ مختلف ہیں۔ یہی گروہ ہے جس کا ذکر قرآن مجید نے ان الفاظ میں فرمایا ہے:۔

اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُوْنَ اَوْ يَعْقِلُوْنَ اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا۔	کیا تمہارا خیال ہے کہ ان میں سے اکثر سنتے اور سمجھتے ہیں؟ یہ تو بس چوپایوں کی طرح ہیں۔ بلکہ ان سے بھی زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں۔

اسی طرح کے لوگوں کے بارہ میں دوسری جگہ فرمایا ہے:۔

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا	ان سے پوچھو کہ کیا میں تمہیں خبر دوں ان لوگوں کی جو بالکل ہی گھاٹے میں رہے؟ یہ وہ لوگ ہیں جن کی ساری

وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا ۝ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا۔

سرگرمیاں دنیا کی زندگی کی لذتوں کے حاصل کرنے میں بسر ہوئیں اور وہ یہ سمجھتے رہے کہ وہ بڑا اچھا کام کر رہے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کی نشانیوں کا اور اس کی ملاقات کا انکار کیا تو ان کے سارے اعمال اکارت ہو کے رہ گئے۔ ہم ان کو قیامت کے دن کوئی وزن نہیں دیں گے۔

یہ حب عاجلہ کے گرفتاروں کی عام قسم ہے۔ دنیا میں زیادہ تعداد ایسے ہی لوگوں کی ہوتی ہے جو دنیاوی لذتوں اور راحتوں ہی کو اپنا مقصودِ زندگی سمجھتے ہیں اور انہی کے حاصل کرنے اور انہی کی فراہمی میں اپنی زندگیاں گنوا دیتے ہیں لیکن ان کے اندر ایک قسم ایسے لوگوں کی بھی ہوتی ہے جو ان حقیر نفسانی لذتوں اور راحتوں کے مقابل میں کچھ بلند مقاصد اور بلند اقدار کے طالب ہوتے ہیں لیکن اگر غور سے دیکھیے تو معلوم ہو گا کہ ان کے یہ بلند مقاصد اور بلند اقدار بھی حب عاجلہ ہی کی ایک قسم ہیں۔ بس فرق یہ ہے کہ عام قسم کے پست ذہن لوگ اپنے شخصی اغراض اور ذاتی فوائد ہی کے دائرہ کے اندر بند رہ جاتے ہیں۔ اس سے آگے انہیں ان خوبیوں اور ان کمالات کو اپنانے کا حوصلہ نہیں ہوتا جو ان کو خدا کی نظر میں نہ سہی کم از کم سوسائٹی ہی کی نظروں میں کچھ عزت و عظمت دلا سکیں لیکن ان میں سے جن کے اندر کچھ ذہانت ہوتی ہے وہ محدود شخصی اغراض و منافع سے آگے بڑھ کر کچھ ایسے کمالات حاصل کرنے کے لیے بھی ہاتھ پاؤں مارتے ہیں جو مجرد حب ذات کے نصب العین سے بلند ہوتے ہیں لیکن یہ بلندی اس سے زیادہ نہیں ہوتی کہ آدمی اپنی ذات اور اپنے نفس کی پرستش سے نکل کر اپنی سوسائٹی کی بندگی اور غلامی میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ اس طرح کے لوگ بلاشبہ علوم اور کمالات کے طالب ہوتے ہیں لیکن یہ انہی علوم کو علوم اور انہی کمالات کو کمالات سمجھتے ہیں جو وقت کی سوسائٹی میں ان کو عزت اور شہرت دلا سکیں یا جن سے وہ اپنے دنیاوی مقاصد زیادہ سے زیادہ آسانی کے ساتھ حاصل کر سکیں۔ یہ لوگ درحقیقت اپنے وقت کی سوسائٹی کے بندے ہوتے ہیں۔ سوسائٹی جن چیزوں کو پسند کرے یہ اس کے حاصل کرنے کے لیے اپنا سارا زور و زر صرف کرنے کے لیے تیار ہو جائیں گے اگرچہ حقیقت کے نقطۂ نظر سے ان کی کوئی قدر و قیمت نہ ہو۔ اور اگر سوسائٹی کے اندر ایک چیز کی مانگ نہ ہو تو وہ اس چیز کی

طرف کبھی مڑ کے بھی نہ دیکھیں گے اگرچہ وہ چیزیں آسمان ہی سے کیوں نہ اتری ہوں۔ سوسائٹی میں اگر طلب ہو تو یہ سحر و ساحری اور علم فراست الید (PALMISTRY) کو بھی لعل و گہر سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ لیکن اگر سوسائٹی میں مانگ نہ ہو تو نبیوں اور رسولوں کا علم بھی ان کی نگاہ میں مینگنی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔

قرآن مجید میں ایسے ہی لوگوں کے بارہ میں فرمایا گیا ہے

اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ يُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَيَذَرُوْنَ وَرَآءَهُمْ يَوْمًا ثَقِيْلًا ۔ — یہ لوگ عاجلہ کو پسند کرتے ہیں اور اپنے آگے ایک بھاری دن کو نظر انداز کر رہے ہیں۔

شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے اسی حب عاجلہ کے حجاب کو حجابِ طبع اور حجابِ رسم کی اصطلاحات سے تعبیر کیا ہے اور ان دونوں حجابوں کی وضاحت اس طرح فرمائی ہے:۔

"تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ انسان کے اندر کھانے پینے اور جماع کے تقاضے موجود ہیں، علاوہ ازیں اس کا دل مختلف طبیعی تغیرات سے مثلاً غم، خوشی، غصہ اور خوف سے متاثر ہوتا رہتا ہے چونکہ ان میں سے ہر حالت اس بات کی متقاضی ہوتی ہے کہ آدمی کا نفس پہلے سے ان کے اسباب کی طرف متوجہ ہو اور اس کی تمام ذہنی قوتیں دوسری تمام سمتوں سے مڑ کر اسی چیز کی طرف مرکوز ہو جائیں اس وجہ سے ان چیزوں میں وہ زیادہ مشغول رہتا ہے۔ پھر ان میں سے ہر چیز کا اثر انسان کی طبیعت پر بعد میں بھی قائم رہتا ہے، یہاں تک کہ ایک طویل زمانہ ایسی حالت میں گذر جاتا ہے کہ یہ چیزیں اس کو اتنی فرصت ہی نہیں دیتیں کہ وہ کسی اعلیٰ چیز کی طرف متوجہ ہو سکے۔ بلکہ بہت سے لوگ تو اس کیچڑ میں اس طرح پھنس جاتے ہیں کہ انہیں مدت العمر اس سے نکلنا ہی نصیب نہیں ہوتا۔ کتنے ایسے بھی ہوتے ہیں جن پر ان کا نفس اتنا غالب آجاتا ہے کہ وہ سوسائٹی کے رسوم و آداب اور عقل کی ذمہ داریوں کی بھی کوئی پروا نہیں کرتے اور کوئی ملامت بھی ان کو ان کی نفس پرستی سے روک نہیں سکتی۔ اس حجاب کو حجاب نفس کہتے ہیں۔

لیکن جن کے اندر عقل اور ذہانت موجود ہوتی ہے وہ انہی نفسانی ہنگاموں کے اندر کچھ فرصت کے ایسے اوقات بھی نکال لیتے ہیں جن میں وہ نفسانی تقاضوں سے یکسو ہو کر اپنی عقلی اور

عملی قوتوں کے لحاظ سے کچھ نوعی کمالات حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن جب وہ شروع شروع میں آنکھیں کھولتے ہیں اور اپنی قوم کو دیکھتے ہیں کہ وہ اسباب معیشت کی فراہمی، زینت و آرائش کے اہتمام، فخر و مباہات کے ہنگاموں اور فصاحت و خطابت اور علوم و فنون کی سرگرمیوں میں مصروف ہے تو یہی چیزیں ان کے دلوں کو بھی موہ لیتی ہیں اور وہ بھی انہی چیزوں کے حاصل کرنے میں پوری دلچسپی اور پوری سرگرمی کے ساتھ مشغول ہو جاتے ہیں۔ اس کو حجاب رسم اور حجاب دنیا کہتے ہیں اور ایسے کتنے ہیں جو انہی چیزوں میں پھنسے ہوئے رہتے ہیں یہاں تک کہ اسی حالت میں ان کو موت آجاتی ہے[1]۔"

شاہ صاحب کے اس بیان سے صاف واضح ہوتا ہے کہ عموماً دو ہی قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ یا تو وہ لوگ ہیں جو ساری ساری زندگیاں اپنے نفسانی تقاضوں کی تکمیل میں گذار دیتے ہیں اور ان کو اس سے کسی برتر مقصد کی طرف توجہ کرنے کی فرصت ہی نہیں ملتی یا پھر وہ لوگ ہیں جو اگر کمال حاصل کرنے کی طرف توجہ بھی کرتے ہیں تو بس انہی چیزوں کے حاصل کرنے میں اپنی پوری زندگی صرف کر دیتے ہیں جن کو وقت کی سوسائٹی کمال سمجھتی ہے۔ اس سے آگے نہ ان کے نزدیک کمال کا کوئی تصور ہوتا اور نہ اس کے حصول کے لیے ان کے اندر کوئی جذبہ پیدا ہوتا۔ ان کے حصول کمال کی ساری جد و جہد کا منتہا یہ ہوتا ہے کہ اسی طالب دنیا کے ایک جال سے نکلے اور پھر اسی کے دوسرے جال میں جا پھنسے۔ ذالك مبلغهم من العلم۔

(۲) **تکبّر**:۔ علم و معرفت کی راہ میں دوسرا بڑا حجاب تکبّر ہے۔ تکبّر کی تعریف خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سوال کے جواب میں نہایت واضح طور پر فرما دی ہے۔ عبداللہ بن مسعود سے ایک روایت ہے۔

قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد
لا یدخل الجنۃ من کان فی قلبہ مثقال ذرۃ	فرمایا کہ جس کے دل کے اندر ذرہ برابر بھی تکبر ہوگا وہ جنت
من کبر فقال رجل ان الرجل یحب ان یکون	میں نہیں داخل ہوگا۔ ایک شخص نے سوال کیا کہ آدمی اس
ثوبہ حسنا ونعلہ حسنۃ فقال ان اللہ جمیل	بات کو پسند کرتا ہے کہ اس کے کپڑے اچھے ہوں، اس کا

[1] حجۃ اللہ البالغہ۔ باب الحجب المانعۃ عن ظہور الفطرۃ۔

ویحب الجمال، الکبر بطر الحق وغمط الناس جوتا اچھا ہو تو کیا یہ بھی تکبر ہے؟ آپ نے فرمایا کہ اللہ خود صاحب جمال ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے تکبر یہ ہے کہ آدمی حق کا انکار کرے اور لوگوں کو حقیر سمجھے۔

اس سے معلوم ہوا کہ تکبر کی اصل حقیقت حق کا انکار اور دوسروں کو حقیر سمجھنا ہے بعض لوگ اپنے آپ کو اتنی بڑی چیز سمجھنے لگ جاتے ہیں کہ ان کے لیے یہ باور کرنا نہایت مشکل ہو جاتا ہے کہ جس بات کو وہ جانتے اور مانتے ہیں حق اس کے سوا کچھ اور بھی ہو سکتا ہے اور ان کے یا ان کے زمرہ کے سوا کوئی اور شخص بھی کسی احترام یا اعتراف کا مستحق ہو سکتا ہے۔ ان کو جو عزت و نعمت حاصل ہوتی ہے اس کو وہ اللہ کا فضل سمجھنے اور اس پر اس کے شکر گزار ہونے کے بجائے اس کو یا تو اپنا پیدائشی اور خاندانی حق سمجھ بیٹھتے ہیں یا اس کو اپنی کوشش اور قابلیت کا ثمرہ خیال کرتے ہیں اور پھر اس پر اتراتے اور فخر کرتے ہیں۔ اسی چیز کو بعض احادیث میں اعجاب المرء بنفسه (آدمی کی خود فریبی) کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے اور انسان کے لیے تین بڑی مہلک چیزوں میں سے اس کو سب سے زیادہ مہلک شمار کیا گیا ہے۔ حضورؐ کا ارشاد ہے واما المهلكات فهوى متبع وشح مطاع واعجاب المرء بنفسه وهو اشدهن۔ (رہیں تین مہلک چیزیں تو ان میں سے ایک خواہشات کی پیروی ہے، دوسرے بخل کی اطاعت اور تیسرے آدمی کا خود اپنے اوپر فریفتہ ہونا، اور یہ چیز ان تینوں میں سب سے زیادہ سخت ہے)۔

قرآن مجید میں اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ سب سے پہلے خدا کی نافرمانی شیطان نے کی اور اس کی نافرمانی کی تہ میں یہی تکبر کا جذبہ کارفرما تھا۔ چنانچہ اس کے متعلق قرآن مجید میں بار بار یہ الفاظ آئے ہیں: ابیٰ واستکبر۔ اس نے خدا کی اطاعت سے انکار کیا اور تکبر کیا۔

قرآن مجید نے انبیائے کرام اور ان کی قوموں کی جو تاریخ بیان کی ہے اس میں بھی جگہ جگہ اس بات کو نمایاں کیا ہے کہ انبیاء کے انکار میں سب سے پہلے ان کی قوموں کے اسی طبقہ نے سبقت کی جو تکبر میں مبتلا تھا۔ ان لوگوں کو اول تو یہی بات کچھ عجیب سی معلوم ہوتی تھی کہ خدا کی کسی نعمت کا مستحق ان کے اندر سے کوئی ایسا شخص قرار پائے جو ان کی طرح مالدار اور صاحبِ اقتدار نہیں ہے اور اگر اس بات پر کسی طرح وہ اپنی طبیعت کو راضی بھی کر لیتے تھے تو پھر اس بات کو برداشت کرنا ان کے لیے ناممکن ہوتا تھا کہ پیغمبر کے غریب ساتھیوں کو اپنا ساتھی اور اپنا ہم سر

بنائیں اور ان کی صحبت میں برابر کے آدمی کی حیثیت سے بیٹھیں۔

حضرت مسیح علیہ السلام کے زمانہ کے ارباب اقتدار اور مسند نشینوں نے ان کی باتوں کو محض اس وجہ سے قبول نہیں کیا کہ اس سے ان کی علمی و سیاسی برتری کا پندار مجروح ہوتا تھا۔ بعینہٖ یہی چیز قریش کے اکابر کے لیے بھی حجاب بنی رہی۔ وہ کہتے تھے کہ اگر اللہ تعالیٰ نبوت کے منصب پر کسی کو سرفراز کرنے والا ہی ہوتا تو مکہ یا طائف کے کسی رئیس کو اس منصب پر سرفراز کرتا۔ محمدؐ جیسے نادار اور قلاش آدمی کو یہ عزت ہرگز نہ بخشتا۔ اور اگر کبھی بادلِ ناخواستہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلیم کرنے پر آمادہ بھی ہوتے تو اس کے لیے یہ شرط پیش کرتے کہ آپ کے ارد گرد جو غریب و نادار لوگ (ان کے الفاظ میں رذیل اور بیوقوف لوگ) جمع ہو گئے ہیں پہلے آپ ان کو اپنے پاس سے ہٹائیں تب ہم آپ کے پاس آئیں گے۔

بعینہٖ یہی صورت حال ہمیشہ انبیاء کے علاوہ دوسرے مصلحین اور داعیانِ حق کو بھی پیش آئی ہے۔ ان کی پیش کی ہوئی صداقتوں کو سب سے پہلے اور سب سے زیادہ شدت و قوت کے ساتھ انہی لوگوں نے جھٹلایا ہے جو استکبار کے فتنہ میں مبتلا رہے ہیں۔ اسلام کی ابتدائی صدیوں سے لے کر آج تک جتنے مصلح اور داعیٔ حق پیدا ہوئے ہیں ان سب کی سوانح عمریوں کو اگر آپ پڑھیں تو ایک چیز بطور قدرِ مشترک کے آپ کو ملے گی کہ اللہ کے بندوں کے لیے اللہ کی راہ کھولنے کی انہوں نے جو کوشش کی اس میں سب سے زیادہ رکاوٹ یہ متکبرین ہی بنے۔ نہ انہوں نے خود اس راہ پر چلنا پسند کیا اور نہ جہاں تک ان کا بس چلا انہوں نے دوسروں کو اس پر چلنے دینا چاہا۔

اس تکبر کے ساتھ حسد اور غصہ کا پایا جانا بھی لازمی ہے۔ جب ایک حقیقت متکبرین کے تکبر کے علی الرغم ظہور میں آنے کے لیے زور لگاتی ہے اور بالآخر ظہور میں آ کے رہتی ہے تو جو لوگ اس کے دبانے کے درپے ہوتے ہیں ان پر جھنجلاہٹ بھی طاری ہوتی ہے اور حسد کے دورے بھی پڑنے لگتے ہیں اور اس حسد اور جھنجلاہٹ دونوں کے مرکب سے پھر دوسری بہت سی بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں جو آدمی کو حق سے اتنا دور کر دیتی ہیں کہ اس کے لیے حق کی طرف لوٹنے کا کوئی امکان ہی باقی نہیں رہ جاتا۔

(۳) عصبیت جاہلیت:۔ معرفت حق کے حجابات میں سے ایک حجاب عصبیت جاہلیت بھی ہے۔ عصبیت جاہلیت کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص قدیم روایات و مالوفات، قدیم رسم و رواج اور باپ دادا کے

طریقہ کے تعصب میں اس طرح گرفتار ہو جائے کہ نہ ان پر کوئی تنقید برداشت کرنے کے لیے تیار ہو اور نہ ان کی جگہ کوئی اور چیز قبول کرنے پر آمادہ ہو۔ باپ دادا کے طریقہ اور قدیم روایات سے محبت بجائے خود بری چیز نہیں ہے بلکہ نہایت اچھی اور نہایت ضروری چیز ہے لیکن ان کو تنقید سے بالاتر سمجھ لینا اور ان کی جگہ ان سے بہتر چیز کو بھی قبول نہ کرنا جاہلی عصبیت ہے جو علم و معرفت اور خیر و صداقت کے راستہ میں ہمیشہ رکاوٹ بنی ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی ہدایت کو ان کی قوموں نے زیادہ تر اس تعصب کی بنا پر قبول کرنے سے انکار کیا۔ ان کا نظریہ تھا کہ ہمارے باپ دادا جو علم و فضل اور اخلاق و عمل میں بہرحال پچھلوں سے برتر تھے کس طرح ہو سکتا ہے کہ ان کا اختیار کیا ہوا کوئی طریقہ غلط ہو اور بعد والے آکر اس کی اصلاح کریں۔ وہ اس بات کو تسلیم کرنے میں اپنے اسلاف کی توہین اور خود اپنی سبکی شمار کرتے تھے۔ اس وجہ سے نہایت شدت کے ساتھ پیغمبر کی باتوں کی مخالفت کرتے تھے۔ ان کے نزدیک قدامت بجائے خود ان کے عقیدہ و مسلک کی صحت و صداقت کی ایک ایسی دلیل تھی جس کو دنیا کی کوئی اور دلیل باطل نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے مقابل میں نہ وہ عقل کا فیصلہ قبول کرنے کے لیے تیار تھے نہ کسی پیغمبر کی وحی کو کوئی اہمیت دیتے تھے۔ وہ جس راہ پر چل رہے تھے اس پر پوری طرح قانع اور مطمئن تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ انسانیت کے لیے جو کچھ بہتر ہو سکتا تھا وہ سب کچھ باپ دادا پر روشن تھا اب اس میں کسی ترمیم یا کسی اضافہ کی گنجائش نہیں ہے۔ ان کے وجدان علیہ آبادنا کے اندر ان کا ماضی، ان کا حال اور ان کا مستقبل سب کچھ بالکل محفوظ تھا اس وجہ سے وہ اس گنبد سے باہر نکلنے کے لیے کسی طرح بھی آمادہ نہ تھے۔ اگرچہ اس گنبد سے باہر نکلنے کے لیے ان کو کوئی نبی ہی کیوں نہ دعوت دے رہا ہو۔

قدیم سے محبت اور قدامت کے ساتھ غیر معتدل حسن ظن کا یہی جذبہ ہے جس نے ہمارے یہاں اندھی تقلید کی طرح ڈالی۔ اندھی تقلید کا مطلب یہ ہے کہ اگلوں میں سے کسی کے ساتھ اتنا حسن ظن ہو جائے کہ اس کو بجائے خود سند تسلیم کر لیا جائے اور اس کے کسی قول یا فعل کو کتاب و سنت کی کسوٹی پر پرکھنے کی ضرورت محسوس نہ کی جائے۔ یہاں تک کہ اگر اس کا کوئی قول یا فعل کتاب و سنت کے خلاف بھی نظر آئے اور کوئی اللہ کا بندہ اس کی طرف توجہ بھی دلائے جب بھی اسی بات پر اصرار کیا جائے جو اس نے کہی ہے اور اس کی حمایت میں یہ دلیل پیش کی جائے کہ وہ کتاب و سنت کا پچھلوں سے زیادہ جاننے والا تھا اس وجہ سے اس کی بات ضرور کسی نہ کسی

کتاب وسنت کی دلیل پر مبنی ہوگی اگرچہ وہ دلیل ہماری سمجھ میں نہ آرہی ہو۔ اس قسم کی تقلید کتاب وسنت کو عملی اعتبار سے بالکل بانجھ بنا کے رکھ دیتی ہے کیونکہ تقلید زدہ طبقہ اس وہم میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ کتاب وسنت کے اندر سے جو مکھن نکالا جا سکتا تھا وہ اسلاف نے اچھی طرح بلو کر نکال لیا ہے۔ اب جو جو کچھ بچ رہا ہے وہ صرف چھاچھ ہی چھاچھ ہے۔

(۴) غفلت یا لاابالی پن: علم کے لیے ایک بڑا حجاب غفلت اور لاابالی پن بھی ہے۔ غفلت اور لاابالی پن کا مطلب یہ ہے کہ آدمی زندگی کے کسی پہلو پر کبھی سنجیدگی سے غور ہی نہ کرے بلکہ اس کو کسی نہ کسی طرح صرف گذار دینے پر قانع ہو جائے۔

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے عمر یوں ہی تمام ہوتی ہے

اس ذہنیت کے لوگ کبھی اس چکر میں نہیں پڑتے کہ ہم کہاں سے آئے ہیں، کہاں جائیں گے اور جس نے ہمیں اس دنیا میں بھیجا ہے اس نے کس مقصد کے لیے بھیجا ہے اور اگر وہ مقصد ہم نے پورا نہ کیا تو اس کا انجام کیا ہوگا۔ یہ نہیں ہے کہ اس طرح کے سوالات ان کے ذہن میں سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتے، پیدا ہوتے ہیں لیکن یہ لوگ کبھی ان کو حل کرنے میں اپنے آپ کو پریشان نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک یہ معمہ نہ کسی سے حل ہوا ہے اور نہ حل ہوگا اس وجہ سے ان کی ساری جدوجہد اس بات کے لیے ہوتی ہے کہ کسی طرح ان کے عیش اور ان کی بے فکری میں کوئی خلل پیدا نہ ہونے پائے۔ اگر ان کی اس خواہش اور کوشش کے باوجود کوئی تلخ حقیقت سامنے آ ہی جاتی ہے تو بجائے اس کے کہ روبرو ہو کر اس سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کریں وہ اس کے مقابل میں شتر مرغ کی پالیسی اختیار کرتے ہیں یعنی وہ اپنا سر ریت میں چھپا لیتے ہیں اور پھر یہ خیال کر لیتے ہیں کہ وہ تلخ حقیقت گذر گئی۔

حد یہ ہے کہ جو لوگ اس لاابالی پن کے مرض میں مبتلا ہو جاتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی ان آزمائشوں سے بھی کوئی فائدہ نہیں اٹھاتے جن میں وہ مبتلا کیے جاتے ہیں اور اس لیے مبتلا کیے جاتے ہیں کہ ان کا یہ لاابالی پن دور ہو اور وہ اپنی زندگی کے مسائل پر سنجیدگی کے ساتھ سوچنے اور سنجیدہ نتائج پر پہنچنے کی طرف مائل ہوں۔ ان لوگوں کی مثال حدیث میں گدھے سے دی گئی ہے جس کو اس کا مالک کبھی کھول دیتا ہے اور کبھی باندھ دیتا ہے لیکن اس کو کچھ پتہ نہیں کہ کیوں اس نے اس کو باندھا اور کیوں کھول دیا۔

اس گروہ کے اندر ایک عظیم اکثریت ایسے لوگوں کی بھی ہے جن کو زندگی کی ابتدائی ضروریات — روٹی،

کپڑے ـــــ کی فراہمی سے اول تو اتنی فرصت ہی نہیں ملتی کہ وہ کسی اور اعلیٰ اور برتر مقصد کے حاصل کرنے کے درپے ہوں اور اگر فرصت ملتی بھی ہے تو اس کو وہ کسی نہ کسی ایسے مشغلہ میں صرف کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو تھوڑی دیر کے لیے ان کو زندگی کی تلخیوں سے کم از کم غافل ہی کر دے۔ اس مقصد کے لیے ان لوگوں نے کچھ عقل کو مغلوب کر دینے والی منشیات اور طبیعت کو بہلانے والی دلچسپیاں ایجاد کر لی ہیں جن سے وقتی طور پر ان کو کچھ تفریح حاصل ہو جایا کرتی ہے لیکن جوں ہی وہ ان سے الگ ہوتے اور ان سُن کر دینے والی دواؤں کا اثر دور ہوا زندگی کی تلخیوں کی وہ ساری ٹیسیں مزید زور و قوت کے ساتھ پھر عود کر آتی ہیں جن سے نجات حاصل کرنے کے لیے انہوں نے ان سُن کر دینے والی دواؤں کی مدد حاصل کی تھی۔ حالانکہ اگر وہ اپنا یہ تھوڑا سا فرصت کا وقت ان فضولیات پر ضائع کرنے کے بجائے زندگی کی اعلیٰ حقیقتوں کو سمجھنے پر صرف کرتے تو اس سے وہ اپنی دنیا اور آخرت دونوں میں بہتر نتائج حاصل کرتے لیکن ان کا لاابالی پن ان کو کسی ایسی چیز کی طرف متوجہ ہونے نہیں دیتا جس میں کچھ سنجیدگی ہو اور جس کے لیے کچھ دماغ اور عقل صرف کرنے کی ضرورت پیش آئے۔